گیا۔ عربی رسم الخط موقوف کر کے ترکی زبان کے لیے لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا گیا تاکہ ترکوں کا رشتہ اُس تہذیب، اُن خیالات، اُس لٹریچر اور اُس ماضی سے ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے جس کا تعلق عربی رسم الخط کے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ اذان ترکی زبان میں جاری کی گئی اور کوشش کی گئی کہ نماز بھی ترکی ہی میں ادا کی جائے۔ یہ یورپ کی تاریخ کا سبق تھا جو ٹرکی میں دہرایا گیا۔ جس طرح لوتھری تحریک کے بعد ہر قوم نے اپنا قومی چرچ الگ بنانا شروع کر دیا تھا، اسی طرح اِن نادان انقلابیوں نے چاہا کہ ترکی قوم بھی اپنا قومی مذہب الگ بنالے۔

خالدہ خانم اگرچہ خود بھی کچھ بہت صحیح الخیال مسلمہ نہیں ہیں، تاہم مذہب و ریاست کی اس تفریق کے متعلق انکی یہ رائے قابل ملاحظہ ہے:۔

> "اس قانون پر کھلا ہوا اعتراض یہ ہے کہ گو اس نے ریاست کو مذہب کے سیاسی اثر سے آزاد کر دیا مگر مذہب کو ریاست کے سیاسی اثرات کا پابند بنا کر رکھ دیا۔ جو لوگ ابتدا میں مذہب و ریاست کی تفریق کے حامی تھے انہیں یہ امید تھی کہ مذہب آزاد ہو جائیگا۔ اس میں خالص روحانیت کی شان پیدا ہو جائیگی اور وہ پہلے کی طرح لوگوں کی اخلاقی تعلیم و تہذیب کا کام انجام دیگا۔ مگر نئے قانون کی رو سے ترکی میں عیسائی اور یہودی تو اپنے مذہبی امور میں بالکل آزاد ہیں اور مسلمانوں کا مذہب حکومت کا دست نگر ہے"

اب ان ترکوں سے کون کہے کہ تم نے یہ حرکات کر کے کس قدر سخت نادانی کا ثبوت دیا ہے۔ تم نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ تمہارے رہنماؤں میں کوئی قرآن اور سنت کا جاننے والا نہ تھا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ تم میں کوئی یورپ کی تاریخ کو سمجھنے والا اور کوئی واقعات کے اندر حقیقی اسباب و علل کو دیکھنے والا بھی نہ تھا۔ تم میں کوئی اتنی سی بات سمجھنے والا بھی نہ تھا کہ یورپ نے تجربہ سے جس مذہب

کو انتظام دنیا کے ناقابل پایا وہ مسیحی مذہب تھا نہ کہ وہ مذہب جس نے ابوبکر و عمر کی قیادت میں دنیا کا بہترین نظام حکومت چلا کر دکھادیا۔ تم میں کوئی دنیا کی تاریخ سے اور یورپ کی جدید ترین تاریخ سے اتنا سبق حاصل کرنے والا بھی نہ تھا کہ اخلاق و دیانت سے سیاست کا رشتہ ٹوٹ جانے کے بعد صرف شیطنت، درندگی اور حیوانیت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ شاعر حکیم اقبال نے کہا ہے:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو ۔۔۔ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہندوستان میں علمار کی سیاسی خدمات دوسرے مسلم ممالک کی بہ نسبت ہندوستان اس لحاظ سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ یہاں علمار حق کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا اور رہونار ہا جو ضروریات وقت کے مطابق دین کی خدمت کے لیے مستعد ہوا۔ سیاسی بیداری، معاملہ فہمی اور قوت عمل کے اعتبار سے ہم کو کسی دوسرے ملک کے علمار کا اتنا شاندار رکارڈ نہیں معلوم جتنا ہندوستان کے علمار کا ہے، نہ صرف دوسرے مسلم ممالک کے علمار کے مقابلہ میں بلکہ اپنے ملک کے دوسرے مسلمان طبقوں اور مسلمان سیاسی جماعتوں کے مقابلہ میں بھی۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ تاریخی حقیقت نیا انکشاف ثابت ہوگی اس لیے ہم کو تفصیل کی اجازت دیجائے۔

ہم اس سلسلہ میں مولانا سید احمد شہیدؒ اور مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں سیاسی بیداری اور جہاد و تنظیم کی اتنی بڑی پہلی تحریک تھی کہ اسوقت تک ہندوستان میں مسلمانوں میں اتنی وسیع دور رس، ہمہ گیر اور منظم تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ اور یہ تحریک سراسر علمار دین کی تحریک تھی۔

مولانا سید احمد شہیدؒ نے مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے خاندان اور سلسلہ کے علمار، نیز ہندوستان کے دیندار طبقہ کی رفاقت اور اعانت سے تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندوستان میں جہاد و احیار خلافت اسلامیہ کی تحریک شروع

کی، اور ہندوستان کے شمال سے لیکر جنوب تک اور مشرق سے لیکر مغرب تک مسلمانوں میں عام مذہبی جوش، سرفروشی کا جذبہ، اور سیاسی بیداری پیدا کردی۔ اس تحریک سے ہندوستان کے لاکھوں مسلمان وابستہ تھے اور سارے برطانوی علاقہ میں اس کے مرکز قائم تھے۔ سید صاحبؒ نے اپنا اصل مرکز ہندوستان کی شمالی سرحد کو بنایا جو ایک آزاد اور جنگجو علاقہ تھا اور جس سے آزاد مسلم سلطنتوں اور قوموں کا علاقہ متصل تھا۔ اُس وقت تک آپ کا محاذ جنگ پنجاب کی سکھ حکومت کی طرف تھا جسکے علاقہ میں مسلمان مذہبی آزادی اور شہری حقوق سے محروم تھے۔ لیکن آپؒ کا ارادہ تھا کہ قوت کے فراہم ہو جانے اور مرکزیت قائم ہو جانے کے بعد رفتہ رفتہ ہندوستان میں ایک آزاد شرعی حکومت کی بنیاد ڈالی جائے اور غیر مسلم اقتدار کا مقابلہ کیا جائے۔ آپ کو ابتدا میں پوری کامیابی ہوئی۔ ۱۲ ارجمادی الثانی ۱۲۴۲ھ کو سرحدی قبائل امراء و خوانین، ہندوستانی مجاہدین اور علماء و مشائخ نے بالاتفاق آپکے ہاتھ پر بیعت امامت و خلافت کرلی۔ بیت المال قائم ہوگیا۔ زکوٰۃ و عشر کا نظام اور شرعی حدود و تعزیرات جاری ہو گئے۔ کچھ مدت اور متعدد جنگوں کے بعد پشاور مفتوح ہو کر نئی اسلامی حکومت میں داخل ہوگیا۔

لیکن پھر مسلمانوں کی خیانت اور غداری اور ناسازگار حالات کے سبب مجاہدین اسلام کو شکست ہوئی۔ ۲۴ ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء کو سید صاحبؒ اور شاہ اسمٰعیل صاحبؒ بعض دوسرے رفقاء و مجاہدین کیساتھ مقام بالاکوٹ (ہزارہ) میں شہید ہو گئے اور آپکی باقیماندہ جماعت نے سرحد میں ستھانہ اور ہندوستان میں پٹنہ میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔

سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ کی شہادت سے یہ آگ بجھی نہیں بلکہ زیرِ خاک اور پھیل گئی۔ ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ اپنی کتاب "جدید دنیا اسلام" میں لکھتا ہے :-

"شمالی ہند میں ایک وہابی جانباز سید احمد نے پنجابی مسلمانوں کو ابھار کر حقیقتہً

ایک مذہبی سلطنت قائم کر لی مگر انکی ناگہانی موت (۹) سے شمالی ہند میں وہابی فتوحات کا امکان جاتا رہا۔ اس سلطنت کو سکھوں نے ۱۸۳۱ء میں برباد کر دیا۔ لیکن جب انگریزوں نے اس ملک کو فتح کیا تب بھی وہابی عقائد کی سلگتی ہوئی چنگاریوں نے بہت کچھ پریشان کیا۔ یہ خیالات عرصہ تک باقی رہے اور اسباب غدر میں ممد ہوئے اور انہی عقائد نے افغانستان اور شمالی مغربی سرحد کے وحشی قبائل کو ہمیشہ کے لیے مذہبی تعصب میں رنگ دیا۔"

ہندوستان کے مرکز صادق پور پٹنہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی وہ بے نظیر تنظیم، اور جہاد کی وہ عظیم الشان تبلیغ و تربیت کی جسکی مثال مسلمانوں کے داخلہ ہند سے لیکر اس وقت تک نہیں ملتی۔ اس تنظیم و تبلیغ کی وسعت، اس اسلامی نظام کی برتری، اور ان علماء کی سیاسی قابلیت اور انتظامی لیاقت کا تصور کرنے کے لیے اس تحریک کے سب سے بڑے دشمن ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر کی کتاب "مسلمانانِ ہند" کے مندرجہ ذیل اقتباسات پڑھنے چاہئیں :-

"یہ لوگ مشنریوں کی طرح ان تھک کام کرتے تھے۔ بے لوث اور بے نفس لوگ تھے جنکا طریق زندگی ہر شبہ سے بالاتر تھا۔ روپیہ اور آدمی فراہم کرنے کی انتہائی قابلیت رکھتے تھے۔ ان کا کام محض تزکیۂ نفس اور اصلاح مذہب تھا۔"

"میرے لیے ناممکن ہے کہ میں عزت و عظمت کے بغیر ان کا ذکر کروں۔ ان میں سے اکثر نہایت مقدس و مستعد نوجوانوں کی طرح زندگی شروع کرتے تھے اور ان میں سے بہت سے اخیر تک مذہب کے لیے اپنی جانفشانی اور جوش قائم رکھتے۔"

مولانا یحییٰ علی صاحب عظیم آبادی امیر جماعت کے متعلق لکھتا ہے :-

"امیر جماعت یحییٰ علی کے مختلف فرائض تھے۔ وہ ہندوستان میں فرقہ کے روحانی

رہنما کی حیثیت سے تمام جماعتی مبلغین سے خط و کتابت رکھتے تھے اور انہوں نے ایک اصطلاحی زبان میں چند مبہم عبارتیں ترتیب دی تھیں جنکو وہ خود استعمال کرتے اور جنکے ذریعہ وہ اطمینان سے بڑی بڑی رقمیں سلطنت کے مرکز سے سرحد پار باغیوں کے کیمپ (ستھانہ) بھیجتے تھے۔ وہ مسجدوں میں وعظ و تقریر کرتے اور مذہبی دیوانوں کی فوج کو بندوقیں جانچ کر بھیجتے۔"

"لیکن اس سازش کا سب سے زیادہ نازک کام پٹنہ (یا بالفاظ خود چھوٹی خانقاہ) سے سرحد پار باغیوں کے مرکز (بڑی خانقاہ) کو رنگروٹ بھیجنا تھا۔ بنگالی متبعین کو راستہ میں صدہا بے تکے اور پریشان کن سوالات کا جواب دینا پڑتا تھا۔ انکو پنجاب اور شمالی مغربی ہندوستان کے وسیع صوبوں میں سے ہو کر تقریباً دو ہزار میل کا سفر طے کرنا ہوتا تھا جہاں ہر گاؤں میں انکی جسمانی شکل اور زبان ان کو اجنبی ثابت کرتی تھی۔ اس خطرناک کام میں یحییٰ علی کی ذہانت اور انتظامی قابلیت کام کر رہی تھی۔ انہوں نے تمام راستہ پر اپنے وہابی پیر متعین کر دیئے تھے جو جماعت کے معتبر اشخاص کے ماتحت تھے۔ یحییٰ علی کی مردم شناسی اور حسن انتخاب قابل داد ہے کہ ان کے انتخاب کیے ہوئے آدمیوں میں سے ایک شخص کو بھی پکڑے جانے کے بعد خوف و خطر یا انعام کا لالچ اپنے رہنماؤں اور پیشواؤں کے خلاف کسی حرکت پہ آمادہ نہ کر سکا۔" (مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر)

اس تنظیم کی وسعت کا اندازہ بنگال کے کمشنر پولیس کی اس شہادت سے ہو سکتا ہے۔

"اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیرو اسّی اسّی ہزار ہیں جن میں آپس میں مکمل مساوات ہے۔ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا کام سمجھتا ہے

اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں اسکو کسی کام سے عذر نہیں ہوتا۔ (خطوط نمبر ۱۰۰ مورخہ ۱۳ ارمئی ۱۸۴۳ء و نمبر ۴۵ ۱۸۴۷ء)

مسلمانان ہندوستان میں اس جماعت نے جو عام جذبۂ جہاد پیدا کر دیا تھا اس کا اندازہ ڈاکٹر ہنٹر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے۔

"صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے کہ اسکے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز ستھانہ کیمپ کے لیے علحدہ کر کے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے بہت زمانہ کے لیے ستھانہ جا کر خدمت کرتے تھے۔ جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (ٹریکھوں) کے شرادھ کے لیے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہکر چند ماہ کی رخصت لے لیتے تھے کہ انہیں فریضۂ جہاد کے ادا کرنے کے لیے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے" (سرحدی جنگوں اور حکومت برطانیہ سے مقابلہ کی تفصیلات معلوم کرنیکے لیے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب مسلمانان ہند، یا راقم السطور کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" کا چوتھا باب پڑھنا چاہیے)

قدیم و جدید طبقہ ابھی تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس وقت کی باتیں ہیں جب ملک میں کام کرنے والوں کا ایک ہی طبقہ تھا۔ اور وہ علماء اور مذہبی مسلمانوں کا طبقہ تھا۔ جدید تعلیم کی اس وقت تک دعوت نہیں دی گئی تھی اور اسکے نتائج ظاہر نہیں ہوئے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم قائم ہوا جو بعد میں کالج پھر یونیورسٹی بنا۔ اس وقت سے ہندوستان میں قدیم و جدید تعلیم کا فرق نمایاں ہوا۔ علماء نے اس وقت تک حکومت سے مکمل ترک موالات کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں خود شریک ہوئے تھے اور دست بدست جنگ کی تھی۔ بدنام اور شوریدہ سر وہابیوں کے علاوہ

مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی جو دہلی میں رزیڈنٹ کے میر منشی تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے اس جہاد میں عملی شرکت کی تھی۔ حضرت حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کرنی پڑی۔ دوسرے حضرات کو سخت مشکلات پیش آئیں۔ ہنگامہ فرو ہو جانیکے بعد مولانا فضل حق صاحب اور مولوی عنایت احمد صاحب کاکوروی وغیرہ کو بجرم بغاوت و شرکت ہنگامہ حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔

۱۸۶۳ء و ۱۸۶۴ء میں مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری، مولانا احمد اللہ صاحب عظیم آبادی مولانا یحییٰ علی صاحب، مولانا عبدالرحیم صاحب وغیرہ پر حکومت ہند کے خلاف سازش کرنے اور مجاہدین سرحد کی خفیہ امداد کرنے کے جرم میں انبالہ کا مشہور مقدمہ سازش چلایا گیا۔ انکی جائداد ضبط کرلی گئیں اور ان کو اول پھانسی پھر حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ صادق پور (پٹنہ) کے مکانات مسکونہ اور ملزمین کی عمارتیں جوشِ انتقام میں کھود کر پھینک دی گئیں اور انکی جگہ میونسپلٹی کی عمارتیں بنائی گئیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے ایک مدت تک ذرا ذرا سے شبہ پر علماء کو پھانسی، قید اور جلاوطنی کی سزائیں دی جاتی رہیں۔ علماء کا یہ زخم ابھی بھرا نہیں تھا اور ان مظالم کی یاد ابھی انکے حافظہ سے محو نہیں ہوئی تھی۔

اسکے برخلاف علی گڑھ کے تعلیمی و سیاسی مرکز نے مسلمانوں کو غیر مسلم حکومت اور اہلِ حکومت کے ساتھ تعاون و موالات کی پرجوش دعوت دی۔ انگریزی تہذیب و معاشرت، شعائر اور نظام تعلیم کے قبول کرنیکی زبردست تبلیغ کی۔ اور حکومت نے بھی دل کھول کر اس کی امداد اور سرپرستی فرمائی۔ اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں اور انگریزوں کے اتحاد اور اختلاط و اجتماع کی علی گڑھ میں پہلی مرتبہ داغ بیل پڑی۔ پھر جب ۱۸۸۳ء میں بظاہر کالج کی پرنسپلی اور درحقیقت

مسلمانوں کی زمامِ قیادت مسٹر تھیوڈور بیک نے لی تو علی گڑھ کالج ہندوستان میں شملہ و کلکتہ کے بعد برطانوی سیاست کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں مسلمان نوجوانوں کو ذہنی غلامی، خوف و بزدلی، خوشامد و چاپلوسی، پست ہمتی و ملازمت پرستی، نقالی و نمائش اور "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ اس بن کبھی فوج میں اضافہ کرنے کی تجویز پاس کی جاتی تھی، کبھی سرحد پر پیش قدمی اور حملہ کو جائز بتایا جاتا تھا، اور کبھی ان نوجوان مسلمانوں کے ذریعہ سے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر حکومت کے محضرِ وفاداری پر مسلمانوں سے دستخط لیے جاتے تھے۔ اس شاطر پرفن کا جادو صرف نوجوانوں ہی پر نہیں بلکہ اُس "پیرِ دانا" پر بھی چل گیا جس نے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور انگریزوں کے لرزہ خیز مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور جس نے "اسباب بغاوت ہند" جیسی معرکتہ الآرا کتاب لکھی تھی۔ اور یہ جادو بھی ایسا چلا کہ اس نے مسلمانوں کی باگ ڈور پورے طور پر اس انگریز مدبر کے ہاتھ میں دیدی۔ (ملاحظہ ہو مسلمانوں کا روشن مستقبل

مسٹر بیک کے بعد سر تھیوڈور ماریسن اور مسٹر آرچبولڈ مسلمانوں کی سیاست پر مسلط رہے

فرنگی شیشہ سازوں کے ہاتھوں سے قوم کا جو طبقہ تیار ہوا اسکی ذہنیت، عقیدہ اور ہمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دونوں گروہوں کے متضاد رجحانات کا اگر نمونہ دیکھنا ہو تو سر سید کی وہ مشہور تقریر جو انہوں نے کانگریس کے خلاف ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ میں کی، علماء کے اُس فتوے کیساتھ پڑھنی چاہیے جو مولوی عبدالقادر صاحب لدھیانوی نے کانگریس میں شرکت کے جواز میں شائع کیا تھا اور جس پر تقریباً اس وقت کے تمام نامور و معتبر علماء کے دستخط تھے جن میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

خود علی گڑھ کی جماعت میں بھی اِس وفادارانہ سیاست کے خلاف جس شخص نے سب سے

پہلے آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو آزاد سیاست کی طرف دعوت دی وہ طبقہ علمار کا ہی ایک ممتاز فرد تھا یعنی مولانا شبلی نعمانی۔ یہ وہی ہے جنہوں نے مسلم گزٹ میں پرمغز، مدلل اور پرجوش مضامین لکھ کر مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں سیاسی آزاد خیالی کی روح پھونک دی۔ اسکے بعد مسلمانوں کی عام سیاسی بیداری میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ، مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلیؒ، مولانا ابوالکلام صاحب آزاد، مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا جو حصہ ہے وہ تمام جدید سیاسی اختلافات کے باوجود واجب التسلیم ہے۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے بھی جن اصحاب نے آزادانہ سیاسی پالیسی اختیار کی، ابتداءً وہ علمار ہی کے اکسائے ہوئے تھے۔

۱۹۱۴ء سے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے سلسلہ میں جو کام بھی کیا گیا۔ اس میں علما اور غیر علمار دوش بدوش رہے ہیں اور بعد کی تحریکوں کا امتیاز یہ رہا کہ ان پر مذہبی رنگ غالب تھا۔

قبل اسکے کہ ہم اس باب کو ختم کریں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے متعلق ہم کو ڈاکٹر ہنٹر کی یہ رائے بھی پڑھ لینی چاہیے:-

> "ایک باقاعدہ گورنمنٹ کے ساتھ ہمیشہ دنیادار لوگ ہوتے ہیں۔ ہمارے انگریزی اسکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو۔ انکے علاوہ ہمیں آرام طلب جماعتوں، ضعیف الایمان لوگوں اور کچھ جائداد والوں کی امداد حاصل ہے جو آن بان کے ساتھ مسجدوں میں جاتے ہیں مگر اصلی معاملات کے متعلق بہت کم سوچتے ہیں۔" (مسلمانانِ ہند)

ہندوستان و ٹرکی کے علمار کا فرق گذشتہ بیان سے واضح ہو گیا کہ ہندوستان میں علمار کا گروہ بمقابلہ دوسرے ممالک کے، اس ملک کا ترقی پسند، آزاد اور بیدار عنصر رہا ہے۔ وہ سیاسی بیداری اور مذہبی قربانی و سرفروشی میں، ملک کی کسی سیاسی و غیر سیاسی جماعت سے ایک قدم پیچھے نہیں

رہا۔ بلکہ ٹرکی کے برخلاف ہندوستان میں سیاسی بیداری کے دور کا آغاز بھی مذہبی طبقہ اور علماء سے ہوا ہے۔ پس مسلمانوں کے کسی طبقہ کو جو ٹرکی کے انقلابی طبقہ کا ہندوستان میں قائم مقام ہوسکتا ہے (اور مسلمانوں میں ایسا کوئی طبقہ اس وقت تک موجود نہیں) علماء سے وہ شکایات اور بنائے مخالفت نہیں ہوسکتی جو انجمن اتحاد و ترقی کے نوجوانوں یا موجودہ جمہوریت ترکیہ کے بانیوں کو اپنے علماء سے تھی۔ اگر یہاں کبھی مذہب وسیاست میں تفریق کی گئی تو اسکے اسباب و محرکات وہ نہیں ہونگے جو ٹرکی میں تھے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں علماء کے خلاف رجحان موجود ہے اور وہ تقریر و تحریر میں ظاہر ہوتا ہے۔ موجودہ اسلامی سیاست کے ایک مشہور قائد نے بارہا اپنے اس کارنامہ پر فخر کیا ہے کہ انکی جماعت نے علماء کو سیاست سے نکال دیا ہے۔ لکھنؤ کے ایک روزنامہ نے اس موضوع پر مسلسل افتتاحیے لکھے ہیں کہ علماء کو سیاست سے خارج کر دینا چاہیے۔ مقالات و رسائل کا کوئی حد و شمار نہیں علماء سے صاف صاف مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ حسب معمول قدیم درس و تبلیغ کا کام سنبھالیں اور اس میدان کو اس کے شہ سواروں کے لیے چھوڑ دیں۔ ایک عالم نے خوب فرمایا کہ جب علماء سیاست میں شریک نہیں تھے تو ان پر حجرہ نشینی اور دنیا سے بے خبری کا سب سے بڑا الزام تھا اور انکو سیاست میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ جب وہ میدان میں آئے اور انہوں نے اپنے ایثار و قربانی سے اپنی جگہ پیدا کر لی تو ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ واپس جائیں اور انہیں حجروں میں معتکف ہو جائیں"۔

ہم کو علم ہے کہ اس جدید طبقہ میں کثرت سے مخلص اور صاحب حمیت مسلمان ہیں اور ان میں سے بہت سے اسلامی حقائق کو شائد بہت سے علماء سے اچھا سمجھتے ہیں۔ ہم ان سے کہنا چاہتے ہیں کہ مذہب و سیاست کا یہ انفصال الحاد کا پیش خیمہ اور وہ "مسیحی فتنہ" ہے جس نے

یورپ کی جمہوریت کو چنگیزی بنادیا ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

علمار کی خدمت میں | اب ہم کو علمار کی خدمت میں بھی یہ عرض کرنا ہے کہ آپ کے فرائض اس عہد انقلاب میں اتنے بڑھ گئے ہیں جتنے شائد ہی تاریخ اسلام کے کسی عہد میں رہے ہوں۔ شریعت، ثقافت، مدنیت اور اسلامی زاویۂ نظر کی حفاظت اور وہ تمام فرائض جو کسی اسلامی سلطنت سے کسی زمانے میں ہوسکتے تھے، اب خالصتہً آپ کے فرائض ہیں۔ آپ ان تمام غلطیوں اور کوتاہیوں سے بچیے جو قرون متوسطہ کے مذہبی طبقہ اور انیسویں بیسویں صدی کے ترکی علمار سے ہوئیں، جنکی تفصیل گذشتہ اوراق میں گذر چکی ہے۔ ورنہ نوجوانوں کے الحاد، لاکھوں مسلمانوں کے سوءِ خاتمہ اور ساری قومی زندگی کی غیر مذہبیت کا گناہ آپکے سر ہوگا، جس کا کوئی عبادت، کوئی علمی، تدریسی، تصنیفی خدمت کفارہ نہیں کرسکیگی، اور تاریخ اسلام سے آپکا یہ گناہ کبھی محو نہ ہوگا۔ میں آپ کو "تو بازمانہ بساز" کی تعلیم نہیں دیتا، میں تو اس فلسفہ کا قائل ہوں:

حدیثِ کم نظراں ہے تو بازمانہ بساز

زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

لیکن اس "بازمانہ ستیز" کے لیے آپ کو نئے ہتھیاروں سے مسلح ہونا پڑے گا، اور جدید فنون وطریقۂ جنگ سے آگاہی پیدا کرنی ہوگی۔ طریق و اسلحۂ جنگ کے اختلاف وتنوع سے آپکے مقصدِ جنگ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آپکا مقصد ایک ہی ہونا چاہیے اور وہ اسلامی شریعت، اسلام کے وقار، اسلامی تہذیب وثقافت کی حفاظت اور اسلام کا نظام حکومت و نظام تمدن قائم کرنا ہے۔ آج الحاد، فلسفہ واعتزال اور علم کلام کے مسائل کی راہ سے نہیں آتا۔ عقلیت اور سائنس کی راہ سے اگر آتا ہے تو بہت کم آتا ہے۔ آج کا الحاد، سیاست کی راہ سے اور جدید سیاسی، اقتصادی

اور تمدنی نظریوں اور تحریکوں کی راہ سے آرہا ہے اور بڑی سرعت و قوت کے ساتھ آرہا ہے۔
سب سے بہتر اور موثر طریقہ پر اسکو بحث و جدل سے نہیں بلکہ عمل اور سیاسی اقتدار سے روکا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس بے عملی کے زمانہ میں بھی سب سے بڑی دلیل و برہان عمل، اور عقلیت کے اس دور میں بھی سب سے بڑی منطق اقتدار کی منطق ہے۔ آپ سیاست میں ضرور شریک ہوں، لیکن اس ہنگامہ میں اپنا مقصد نہ بھولنے پائیں، اور آپکی حیثیت ایک منٹ کے لیے بھی کسی جماعت کے آلۂ صوت یا آلۂ کار کی نہ ہونے پائے، اور آپکو کوئی سیاسی جماعت اپنے مقصد سے غافل نہ کرنے پائے نہ اپنے مقصد کے لیے فریب دینے پائے۔ اس وقت عالم انسانیت ہمیشہ سے بڑھ کر اس کا محتاج ہے، اور سب ملکوں سے بڑھ کر اس زمانہ میں یہ فرض اہم ترین ہے کہ دنیا میں اسلام کا نظام حکومت اور نظام حیات قائم کیا جائے ظاہر ہے کہ یہ مقصد صرف آپکا ہو سکتا ہے اور یہ کام صرف آپ ہی سے انجام پا سکتا ہے۔ اگر آپنے اپنی زندگی اور اپنی سعی و جہد کا کوئی دوسرا مقصد قرار دے لیا تو یقین جانیے اللہ تعالیٰ یہ منصب آپ سے لیکر کسی دوسری جماعت کو سپرد فرما دیگا اور اسکو اسکی اہلیت و توفیق عطا فرمائیگا۔ وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔

مطبوعات

مجدد الف ثانی کا تصور توحید تالیف ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (بزبان انگریزی)۔ ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب۔ کشمیری بازار، لاہور۔

مسلمانوں میں وحدت وجود کا خیال ابن عربی اور شہاب مقتول (صاحب حکمۃ الاشراق) کی بدولت مقبولِ عام ہوا اور رفتہ رفتہ تصوف، اخلاق، فلسفہ، ادب، شعر، سب پر حاوی ہوگیا، یہاں تک کہ دین و شریعت کے علم و عمل کو بھی اس نے بہت کچھ ماؤف کیا۔ آخر کار اس وبائے عام کے خلاف جہاد کرنے کے لیے دو مردِ خدا اٹھے جنکی کوششوں سے بڑی حد تک اس کا زور ٹوٹا۔ ایک ابنِ تیمیہ، دوسرے شیخ احمد سرہندی رحمہما اللہ۔ لیکن ابن تیمیہ کا جہاد فی الواقع اتنا کارگر ثابت نہ ہوا جتنا شیخ مجدد کا جہاد۔ کیونکہ ابنِ تیمیہ کا حملہ خالص علوم شریعت اور استدلال کے ہتھیاروں سے تھا جن سے بچنے کے لیے ارباب تصوف کے پاس یہ حیلہ موجود تھا کہ تم اس کوچہ کے آدمی ہی نہیں ہو۔ بخلاف اسکے شیخ مجدد خود اس کوچہ ہی کے آدمی تھے، اور معمولی آدمی نہیں بلکہ شہسوار تھے۔ انہوں نے خود تصوف ہی کے ہتھیاروں سے اس عقیدہ کی خبر لی اور ایسی خبر لی کہ تسمہ تک لگا نہ چھوڑا۔ ارباب تصوف کہتے تھے کہ ہم کشف و شہود کی باطنی حس سے حقیقت کا مشاہدہ کرنے گئے اور ہم نے یہ پایا کہ خالق و مخلوق، عبد و معبود، دو جداگانہ وجود نہیں بلکہ ایک ہی وجود ہیں، یعنی خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ۔ شیخ مجدد نے جواب میں پورے زور کے ساتھ کہا کہ میں خود یہی باطنی حس لے کر مشاہدہ کرنے گیا تھا، اور جہاں تک تم پہنچے اس سے آگے پہنچ کر میں نے یہ پایا کہ حقیقت براہِ راست ہمارے علم و ادراک کے احاطہ میں نہیں آسکتی، ہمارے لیے اسکے سوا چارہ نہیں کہ نبی کے اعتماد پر بس ایمان